پروفیسر حامدی کاشمیری اور اکتشافی تنقید۔ایک مکالمہ

مکالمہ نگار : سبزار احمد بٹ، سری نگر
لیکچرر محکمہ اسکول ایجوکیشن، جموں وکشمیر
رابطہ 9906417975

[یہ مکالمہ اردو ادب کے نامور نقاد اور شاعر پروفیسر حامدی کاشمیری اور سبزار احمد بٹ کے مابین ہوا ہے۔ایک انٹرویو کی صورت اس مکالمے میں حامدی صاحب کے مشہور نظریے اکتشافی تنقید پر مدلل بحث ہوئی ہے۔یہ نظریہ ایک ایسا نظریہ ہے جس نے ابتدائی دنوں میں اردو حلقوں میں خوب شہرت پائی لیکن آئندہ اسی رفتار سے یہ نظریہ متنازعہ بھی ہوتا چلا گیا۔پیش ہے اسی موضوع کو مرکز بناتے ہوئے حامدی صاحب سے کی گئی گفتگو۔]

پروفیسر حامدی کاشمیری کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔نہ صرف کشمیر بلکہ برِصغیر کا اردو داں طبقہ ان کی جامع اور کثیر الجہت علمی شخصیت سے متعارف ہے وہ کئی برسوں تک کالج اور یونیورسٹی سطح پر درس وتدریس کے پیشہ سے وابستہ رہے اور بالآخر کشمیر یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے طور پر سبکدوش ہوئے ان کا علمی سفر شاعری، فکشن نویسی، تحقیق اور تنقید کے متنوع وظائف پر محیط ہے ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ پروفیسر حامدی کاشمیری کی شخصیت خود میں ایک جامع علمی ادارے کی حیثیت رکھتی ہے تاہم جس میدان میں انھوں نے اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی وہ تنقید ہے ان کی تنقیدی کاوشیں کم وبیش ۲۶ کتابوں پر محیط ہیں جن میں انھوں نے شاعری فکشن اور نظریاتی تنقید کے منطقوں پر معنی خیز اور فکر انگیز مباحث قائم کئے ہیں۔تنقید کے میدان میں جس کتاب نے ان کی منفرد شناخت قائم کی وہ ''اکتشافی تنقید کی شعریات'' ہے۔یہ وہ کتاب ہے جس نے اردو میں ایک نئے تنقیدی ڈسکورس کی بنیاد رکھی، مذکورہ کتاب کو ادبی حلقوں میں سراہا بھی گیا اور کچھ لوگوں نے اعتراضات بھی قائم کئے ہیں۔کچھ لوگوں نے یہ شکایت بھی کی کہ حامدی کاشمیری کی تنقیدی تھیوری موہوم اور ناقابلِ فہم ہے لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ ان سے ابھی تک ان کی تھیوری کے بنیادی مفروضات اور اس پر قائم کیے جانے والے اعتراضات کے حوالے سے کسی نے بھی مفصل گفتگو نہیں کی۔اسی ضرورت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے راقم نے محکمہ اعلیٰ تعلیم کے پرنسپل سکریٹری اور مجلہ کے مدیر ڈاکٹر اصغر ساموں کی ایما پر موصوف سے انٹرویو کی درخواست کی، جسے انھوں نے طبیعت کی ناسازی اور ضعیف العمری کے باوجود خندہ پیشانی کے ساتھ قبول کیا جس کیلئے راقم ان کا بہت شکر گزار ہے۔

سوال : حامدی صاحب یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ آپ کی علمی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے دنیائے علم وادب میں آپ نقاد، محقق، شاعر اور فکشن نویس کی حیثیت سے ایک بلند مقام رکھتے ہیں تاہم ادب کے جس شعبے میں آپ نے اپنی صلاحتیوں کا لوہا منوایا ہے وہ تنقید ہے یوں بھی کہا جاسکتا ہے کہ آپ کی تنقیدی بصیرت کا اعتراف پورے برِصغیر میں کیا جاتا ہے اور اس حوالے سے جس کتاب نے آپ کی منفرد شناخت قائم کی، وہ ''اکتشافی تنقید کی شعریات'' ہے اس کتاب کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا کہ اردو میں

تھیوری سازی کے تعلق سے یہ ایک منفرد کاوش ہے پہلی بات تو میں آپ سے یہ پوچھنا چاہوں گا کہ اکتشافی تنقید کا جو خا کہ آپ کے ذہن میں ابھرا اس کے پسِ پشت کون سے اسباب وعوامل کارفرما ہیں دوسری یہ کہ اگر ہمارے پاس پہلے سے ہی مشرقی ومغربی تصوراتِ نقد کی ایک اچھی خاصی تعداد موجود تھی اور اردو کے کم وبیش سارے نقاد قائم شدہ تصورات سے ہی اخذ واکتساب کر کے ادب کی تحسین کے وظائف سرانجام دے رہے تھے تو اس کے باوجود آپ کو کیوں ادبی متون کی تحسین کے حوالے سے ایک نئے نظریے کی ضرورت محسوس ہوئی؟

جواب : دیکھئے سب سے پہلے تو میں یہ کہوں گا کہ دنیائے علم وفکر کا تحرک اختلاف اور انحراف کی وجہ سے قائم ہے اگر قائم شدہ علمی اور فکری وظائف سے اختلاف اور انحراف نہ کیا جاتا، تو آج علمی اور فکری اعتبار سے دنیا جس مقام پر کھڑی ہے اس کا حصول ناممکن تھا۔ اب جہاں تک آپ کے سوال کا تعلق کہ میرے ذہن میں اکتشافی تنقید کا خا کہ کیونکر ابھرا، تو اس حوالے سے میں یہ کہنا چاہوں گا، جس زمانے میں، میں پرورش لوح وقلم میں آج کے مقابلے میں بہت زیادہ سرگرم تھا اس زمانے میں لکھنے کے ساتھ ساتھ میرا زیادہ وقت مطالعہ میں صرف ہوتا تھا درس وتدریس، ادبی محافل میں شرکت، اور انجمنوں کی میٹنگوں میں شرکت کو چھوڑ کر میرے پاس جتنا بھی وقت بچتا تھا میں اسے پڑھنے لکھنے میں صرف کرتا تھا اس دور میں اردو، انگریزی اور فارسی کے تخلیقی متون میرے مطالعے کے بنیادی معروضات میں شامل رہیں، اس کے ساتھ ساتھ میں ان متون پر لکھی جانے والی تنقید کا بھی جائزہ لیتا رہا اس دوران خصوصاً جو چیز میرے مشاہدے سے گزری، وہ یہ تھی کہ ہر تنقیدی کاوش کی تان بالآخر معنی پر آ کر ٹوٹتی تھی چاہے وہ انگریزی تنقید ہو یا پھر اردو تنقید، آہستہ آہستہ میں نے یہ محسوس کیا کہ شعر یا افسانے کی تخلیقی شناخت اس میں پیش کیا جانے والا تجربہ قائم کرتا ہے جو متن کی لسانی اکائیوں میں مستور ہوتا ہے مثال کے طور پر میں اپنا ایک شعر پیش کروں گا:

کوئی حسرت کوئی ارماں نہیں ہے
تیرے آنے کا اب امکاں نہیں ہے

اگر مروجہ تنقید کے تناظر میں اس شعر کو دیکھا جائے تو اس کی رو سے اس کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ شاعر محبوب سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ تیرے آنے کا کوئی امکان نہیں ہے اس لیے مایوسی ہی مایوسی ہے اور شاعر اس شعر میں حد درجہ مایوسی کا اظہار کر رہا ہے اس طرح کی اپروچ سے تنقید کا وظیفہ بے معنی ہو کے رہ جاتا ہے تخلیقی متن میں مضمر جہت در جہت تجربہ پسِ پردہ ہی رہتا ہے اردو اور انگریزی کی تنقیدی نگارشات کا مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ تخلیقی متن میں مستور تجربے کے حوالے سے کسی نے بھی نہیں لکھا ہے اس کے بعد میں نے اپنی تھیوری پر کام کرنا شروع کیا۔ اکتشافی تنقید سے متعلق جب میرے ذہن میں ایک ٹھوس خا کہ ابھرا تو میں نے سب سے پہلے اس کے بارے میں گوپی چند نارنگ کو خط لکھا، انھوں نے جواباً مجھ سے کہا کہ ''حامدی صاحب میں یہ کہنے کی گستاخی کروں گا کہ آپ کا نظریہ غلط ہے۔ آپ کا اپروچ مذہبی ہے اور میں آپ کی تھیوری کے کسی بھی مفروضے سے متفق نہیں ہوں بہتر یہ ہوگا کہ آپ اپنے اس خیال کو ترک کریں۔'' لیکن نارنگ صاحب کی مخالفت کے باوجود میں اپنے نظریے پر قائم رہا۔ شعر وادب کے مسلسل مطالعے

کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا کہ اصل میں لفظ ہی ہمیں شعر کی روح تک پہنچاتا ہے تفہیم شعر کے حوالے سے مروجہ تنقید کا اصرار معنی کی دریافت پر ہے لیکن میرا موقف یہ ہے کہ شعر کی روح میں اترنے کے لیے معنی کے بجائے تجربے کی شناخت لازمی ہے جس کے بعد میں نے شعر وادب کی تحسین کے حوالے سے مروجہ تناظرات سے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ کیونکہ برصغیر میں لکھی جانے والی اردو تنقید کا دائرہ کار متن سے کشیدِ معنی تک سمٹا ہوا تھا ہر تنقیدی کارگزاری کی تان بلآخر معنی پر ہی آکے ٹوٹتی تھی۔

سوال : حامدی صاحب ضمناً میں آپ سے پوچھنا چاہوں گا، آپ نے کہا کہ جب آپ نے گوپی چند نارنگ سے اپنی تھیوری کے حوالے سے بات کی تو انھوں نے آپ سے کہا کہ آپ کا نظریہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے مذہبی ہے دوسرے لفظوں میں کہیں تو آپ کا نظریہ، شعر سے متعلق رائج مذہبی اپروچ کی چغلی کھاتا ہے انھیں آپ کے نظریے میں کون سی ایسی بات نظر آئی جس کی بنا پر انھوں نے آپ کی تھیوری کو مذہبی قرار دیا؟

جواب : پہلی بات تو یہ کہ جب سے ہمارے درمیان یہ اختلاف ہو گیا اس دن سے میں نے نارنگ صاحب کے ساتھ گفت و شنید کا دروازہ بند کیا مجھے یہ محسوس ہوا کہ نارنگ صاحب نے میری تھیوری کو سمجھے بغیر ہی اس کے متعلق ایک موضوعی نوعیت کی رائے قائم کرلی ہے جس کا میری تھیوری کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ انھوں نے ایک دفعہ مجھ سے یہ بھی کہا کہ میرا نظریہ گمراہ کن ہے۔ ان کے مطابق جب میں شعر کے باطنی تجربے یا پھر اس کے وہبی ہونے کی بات کرتا ہوں تو میں صوفیوں کی رائے کو دوہراتا ہوں یا جب میں تجربے کی پراسراریت کی بات کرتا ہوں تو میں شعر سے متعلق رائج مذہبی تصور کو انگیز کرتا ہوں انھوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ شعر کے اندر باہر کچھ بھی نہیں ہوتا ہے شعر، شعر ہے اور اس کی شناخت اس سے ابھرنے والے معنی کی وجہ سے قائم ہے۔

لیکن نارنگ صاحب کی تنقیص کے باوجود میں اپنے موقف پر قائم رہا اور اپنے نظریے کے ٹھوس پن کو ثابت کرنے کے لیے میں نے ۱۹۹۹ء میں ''اکتشافی تنقید کی شعریات'' نامی کتاب میں اپنی تھیوری کے بنیادی postulates کو قارئین کے سامنے لایا۔ جب میری کتاب منظر عام پر آئی تو کچھ لوگوں نے کہنا شروع کردیا کہ اگر میری تھیوری واقعی ٹھوس ہے تو میں اس کی اطلاقی مثالیں پیش کروں، دوسرے لفظوں میں کہیں تو کچھ لوگوں نے میری تھیوری کو مشتبہ قرار دیا۔ جس کے بعد میں نے ''اردو نظم کی دریافت'' اور ''اردو افسانہ۔ تجزیہ'' لکھ کر شعر اور افسانے کے حوالے سے اپنی تھیوری کے اطلاقی امکانات کو پیش منظر پہ لایا۔

سوال : حامدی صاحب آپ نے اپنی کتاب ''اکتشافی تنقید کی شعریات'' میں معنی کے بجائے تجربے کی دریافت پر زور دیا ہے آپ کے مطابق شعر تجربے کا اکتشاف کرتا ہے نہ کہ معنی کا، لیکن آپ کے ایک شاگرد اور ماہرِ لسانیات پروفیسر نذیر احمد ملک نے ''بازیافت'' نامی رسالے میں آپ کی تھیوری کے حوالے سے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ حامدی صاحب معنی کے منکر نہیں بلکہ حامدی صاحب معنی کی وحدانیت کے منکر ہیں۔ کیا آپ ان سے متفق ہیں؟ کیا تجربے اور معنی کی تکثیریت کو آپ ایک ہی چیز قرار دیتے ہیں؟

جواب : دیکھئے نہ صرف پروفیسر نذیر احمد ملک نے بلکہ ان کے علاوہ بھی بہت سارے لوگوں نے میری تھیوری پر لکھا ہے اور کچھ دانش گاہوں میں اس پر تحقیقی مقالے بھی لکھے گئے ہیں میری اطلاقی تنقید اور تھیوری کو کس نے کس تناظر میں سمجھا ہے میں اس

پر پابندی عائد نہیں کر سکتا ہوں میری تھیوری یا کسی بھی تھیوری پر رائے قائم کرنا قاری کا جمہوری حق ہے جس کی معروضیت یا صداقت کو ثابت کرنا میرا کام نہیں ہے جہاں تک معنی اور تجربے کا تعلق ہے تو میں نے اس پر اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ معنی الگ چیز ہے اور تجربہ الگ چیز ہے پھر سے میں آپ کو مثال دیتا ہوں، حال ہی میں، میں نے ایک غزل لکھی ہے اس کے چند شعر یوں ہیں:

کوئی حسرت کوئی ارماں نہیں ہے
تیرے آنے کا اب امکاں نہیں ہے
گھرا ہوں کالی دیواروں میں کب سے
نکل جانے کا اب امکاں نہیں ہے
سفر اب یم بہ یم جاری رہے گا
کوئی اندیشۂ طوفاں نہیں ہے

اگر ہم پہلے شعر کے سطحی معنی کو دیکھیں جیسے کہ میں نے آپ سے پہلے بھی کہا کہ اس کے معنی یہ نکلتے ہیں کہ شاعر محبوب کی آمد سے متعلق مایوسی کا شکار ہو چکا ہے۔لیکن ان اشعار سے ابھرنے والا تجربہ تہہ در تہہ ہے، جہت در جہت صورتحال کا انکشاف کرتا ہے پہلے شعر کے حوالے سے بات کی جائے تو اس میں ایک فرضی صورتحال ابھرتی ہے ایک شعری کردار سامنے آتا ہے جو شاعر کی ذات سے ایک الگ شناخت رکھتا ہے اور اپنی ماہیت کے اعتبار سے فرضی ہے حسرت اور ارماں کے الفاظ کردار کے داخلی منظر نامے کی نمائندگی کرتے ہیں اس شعر میں مخاطب کا کردار بھی ابھرتا ہے۔مختصراً کہیں تو مذکورہ شعر ایک مکمل ڈرامائی صورتحال کی تجسیم کرتا ہے۔اب اگر دوسرے شعر کے حوالے سے بات کی جائے:

گھرا ہوں کالی دیواروں میں کب سے
نکل جانا کوئی آساں نہیں ہے

تو اس کے معنی یہ نکلتے ہیں، کہ میں مشکلوں میں پڑ گیا ہوں لیکن ان سے چھٹکارا پانا ناممکن ہے اب اگر اس شعر سے ابھرنے والی ڈرامائی صورتحال کی بات کی جائے تو اس شعر سے ابھرنے والا شعری کردار ایک ایسے مکان میں مقید ہے جس کی دیواریں کالی ہیں لفظ ''کالا'' اس شعر میں جن تلازمات (implicatures) کو ابھارتا ہے یا پھر شعر سے ابھرنے والا کردار اصل میں کس طرح کی صورتحال سے دوچار ہے یہ سمجھنا لازمی ہے۔

شعری کردار کالی دیواروں میں مقید ہے اسے دوسرے کردار پوچھتے ہیں کہ تو ان کالی دیواروں میں مدتِ دراز سے مقید ہے اب تجھے اپنی رہائی کی سبیل کرنی چاہیے لیکن یہ ان سب سے کہتا ہے کہ ''نکل جانا کوئی آساں نہیں ہے۔'' شعری کردار، اس کے مخاطب، لفظوں سے ابھرنے والے تلازمات، شعری کردار کی داخلی صورتحال، اس کا لہجہ وغیرہ مل کر شعر کے داخلی تجربے کی تجسیم کرتے ہیں۔

غالب، میر، اقبال، اور فیض وغیرہ کے اشعار میں بھی یہی ڈرامائی صورتحال ابھرتی ہے جو اپنی ماہیت کے اعتبار سے فرضی

ہوتی ہے ان کے اشعار میں جو صورتحال ابھرتی ہے وہ اپنے جلو میں کئی سارے منظر نامے سمیٹتی ہے اس کے برعکس معنی کا سفر مستقیم ہوتا ہے ہم تجربے کو منحنی خطوط کا ایک جال بھی قرار دے سکتے ہیں جس میں صورتحال سے صورتحال ابھرتی ہے۔

سوال : آپ کا موقف یہ ہے کہ تجربہ معنی سے الگ ہے معنی کا سفر مستقیم ہوتا ہے جبکہ تجربہ جہت در جہت ہوتا ہے یہ منحنی خطوط کا جال ہوتا ہے لیکن آپ نے اپنی کتاب ''اکتشافی تنقید کی شعریات'' کے صفحہ ۲۶ پر لکھا ہے کہ ''متن جو کائناتی فینا مینا کی ہی ایک خود مرتکز تصغیری صورت ہے کی کوئی معینہ صورت نہیں ہوسکتی ہے یہ زماں و مکاں کی مانند توسیع اور تعلیق کے مسلسل اور پیچیدہ عمل سے گزرتا ہے اور ہر آن نو بہ نو جلوں کو خلق کرتا ہے''۔ اسی کتاب کے صفحہ ۷۵ پر آپ لکھتے ہیں کہ ''ہیتی تنقید سے میرا طریق کار اس وقت قطعی مختلف ہوجاتا ہے جب میں ہیتی تنقید جو close reading کے ذریعے متن سے کلی یا جزوی موضوع کی کشید کرتی ہے کے خلاف، اسکے ماخذ، محرک یا منشا سے متعارض ہوئے بغیر عضوی یا کلی تخلیقی وجود کی دریافت پر زور دیتا ہوں۔'' اسی کتاب کے صفحہ ۷۹ پر آپ لکھتے ہیں کہ ''شعر کی تکمیل میں شاعر کے شعوری اور لاشعوری عوامل کی طرح منشائے منصف کا بھی عمل دخل رہتا ہے لیکن ان کی کوئی تشکیلی حیثیت نہیں ہوتی ہے یہ بشمول منشائے مصنف اپنی محرکانہ حیثیت ہی رکھتے ہیں اور تکمیل یافتہ تجربہ ان سب سے ماورا ہوتا ہے'' پہلے آپ صفحہ ۲۶ پر لکھتے ہیں کی متن کی کوئی معینہ صورت نہیں ہوتی ہے یہ مسلسل توسیع و تعلق کے عمل سے گزرتا ہے سوال یہ ہے کہ اگر متن مسلسل توسیع و تعلیق کے عمل سے گزرتا ہے تو تکمیل یافتہ تجربہ کس طرح متن میں بار پا سکتا ہے جب متن ہی instable ہے تو تجربہ مکمل کیسے ہوسکتا ہے؟

جواب : تجربہ شعر کی تخلیقیت کو قائم کرتا ہے تجربہ رنگا رنگ ہوتا اور کثیر الجہت بھی، شعر میں استعمال ہونے والے الفاظ بھی multi dimensional ہوتے ہیں غالب کا شعر ہے :

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

مروجہ تنقید اس کے سیدھے معنی یہ نکالتی ہے کہ شاعر خواہشوں کے تشنۂ تکمیل رہنے کی بات کرتا ہے اس طرح کا تشریحی رویہ شعر کی شعریت کو مجروح کرتا ہے مذکورہ شعر میں متکلم خود کلامی کے لہجے میں کہتا ہے یا کسی دوسرے شعری کردار سے مخاطب ہو کر لفظ خواہش کے لباس میں اپنی داخلی صورتحال کو بیان کرتا ہے اور اپنی کسی مخصوص خواہش کا ذکر کئے بغیر ''ہزاروں خواہشیں'' کہہ کر اس کے تعین کو ملتوی کرتا ہے۔ متکلم کہتا ہے کہ میری ہر خواہش اتنی تیز، اتنی شدید اور اتنی عمیق ہے کہ اگر میں اسے سوچنے بیٹھ جاوں تو میرا دم نکل جائے گا۔ جوں ہی قرات معنی کی سطحوں کو چیر کر گہرائی میں اترتی ہے تو تجربے کی رنگا رنگی اپنا اکتشاف کرتی ہے۔

سوال : حامدی صاحب آپ کی دلیلوں سے اتفاق کرتا ہوں تجربہ رنگا رنگ ہوسکتا ہے کثیر الجہت ہوسکتا ہے لیکن پوچھنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ کیا تجربہ مکمل ہوسکتا ہے؟

جواب : تجربہ اگر چہ کلی طور پر مکمل نہیں ہوتا ہے تاہم اپنی ماہیت کے اعتبار سے نامیاتی ہوتا ہے۔ یہ متن کی کلہم لسانی ساخت میں مستور رہوتا ہے۔ متن سے جو کثیر پہلو صورتحال ابھرتی ہے وہ تجربے کی توسیع کا کام سرانجام دیتی ہے تجربہ مختلف رنگوں میں اپنا اکتشاف کرتا ہے۔

سوال : لیکن post-structuralist مکتبہ تنقید سے تعلق رکھنے والے مفکرین کہتے ہیں متن خلقی اعتبار سے instable ہوتا ہے۔اس کی ساخت کو نامیاتی کہنا محض ساختیاتی فکر کا مسلط کردہ مغالطہ ہے جبکہ انتشار اس کی سرشت میں رقم ہوتا ہے؟

جواب : پس ساختیاتی مفکرین بھی کہتے ہیں کہ متن کا ہر لفظ کثیر الجہت صورتحال کو انگیز کرتا ہے۔

سوال : آپ کی تھیوری پر کئی سارے الزامات عائد کیے گئے آپ کے معاصر نقادوں میں بیشتر کی رائے یہ ہے کہ حامدی کاشمیری نے اکتشافی تنقید کے نام سے ہیتی تنقید کو rechristen کیا، یہ بھی کہا گیا کہ آپ کی تھیوری کے بنیادی مفروضات ہیتی تنقید سے مستعار ہیں آپ نے صرف نئی بوتل میں پرانی شراب بیچی؟

جواب : (قہقہہ) میرے خیال میں یہ تاثر بالکل غلط ہے۔ میں وہاں سے اپنا سفر شروع کرتا ہوں جہاں ہیتی تنقید ختم ہوجاتی ہے۔ ہیتی تنقید معنی ومفہوم کے پیچھے پڑ جاتی ہے اس لیے وہ زیادہ دیر تک نہیں پائی اور سین سے ہٹ گئی۔ آپ ایلیٹ کو دیکھیں، غالبؔ کو دیکھیں یا دنیا کے کسی بھی بڑے قلم کار کا جائزہ لیں، ان میں سے ہر ایک تجربے کی تلاش میں رہتا ہے اور تجربہ ہی ہر بڑے تخلیق کار کی شناخت قائم کرتا ہے:

گھرا ہوں کالی دیواروں میں کب سے
نکل جانا کوئی آساں نہیں ہے

ہیتی تنقید کی رو سے اس شعر کے معنی بالکل واضح ہیں۔ پھر سے مذکورہ شعر میں مستور تجربے کی وضاحت کر کے میں خود کو دہراؤں گا نہیں تاہم اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ میری تھیوری ہیتی تنقید کی بنیادوں پر چوٹ کرتی ہے۔

سوال : الزام یہ بھی عائد کیا جاتا ہے کہ حامدی کاشمیری کہتے ہیں تجربہ متن کی لسانی اکائیوں اور تدابیر سے مشروط ہوتا ہے ان تدابیر میں وہ استعارہ، علامت اور پیکر کو کلیدی رول کی حامل قرار دیتے ہیں۔ لیکن ان سے پہلے ہی ہیتی تنقید سے وابستہ نقادوں نے متن سے ابھرنے والے aesthetic experience کو اس کی لسانی تدابیر سے مشروط قرار دیا تھا۔ الزام عائد کرنے والوں کے مطابق آپ جس طرح تجربے کو شعر میں دریافت کرتے ہیں وہ اس کی تلخیص محض ہو کے رہ جاتی ہے؟

جواب : الزام لگانے والوں کا اپروچ غلط ہے یا پھر انھوں نے میری تھیوری کو غور سے پڑھا ہی نہیں ہے اور اس سوال کا جواب میں پہلے ہی دے چکا ہوں۔ سو مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ہے۔

سوال : رسالہ ''استعارہ'' میں گوپی چند نارنگ نے آپ کی تھیوری پر ایک مضمون لکھا ہے اس میں وہ آپ کے تصورِ تجربہ

سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ حامدی کاشمیری کا تصورِ تجربہ بھی اپنی تفہیم کے لیے معنی کا محتاج نظر آتا ہے وہ کہتے ہیں آپ تجربے کی بات کرتے کرتے پھر معنی کی جانب لوٹ جاتے ہیں؟

جواب : دیکھئے نارنگ صاحب کیا کہتے ہیں کیا نہیں کہتے ہیں اس سے مجھے کوئی غرض نہیں ہے۔ میرا موقف یہ ہے کہ معنی الگ چیز ہے اور تجربہ الگ چیز۔ نارنگ صاحب کا مضمون میں نے بھی دیکھا ہے لیکن اس مضمون میں انھوں نے معنی کی ماہیت پر بات نہیں کی ہے پھر سے مثال دیتا ہوں:

کوئی حسرت کوئی ارماں نہیں ہے
تیرے آنے کا اب امکاں نہیں ہے

مذکورہ شعر کے پہلے مصرعے میں جو فرضی کردار ابھر کر سامنے آتا، وہ یا تو خود کلامی کے لہجے میں کہتا ہے یا کسی دوسرے فرضی کردار سے مخاطب ہو کر کہتا ہے مجھے تیرے آنے کی بہت زیادہ توقع تھی۔ لیکن بہت عرصہ گزر الیکن تو نہیں آیا، نتیجتاً جو ارمان اور حسرتیں میں نے تیری ذات سے وابستہ کر رکھی تھیں وہ اپنی شدت اور حرارت کھو چکی ہیں۔ دوسرے مصرعے میں متکلم اپنے مخاطب (جو حاضر بھی ہوسکتا ہے اور غائب بھی) کے حوالے سے کہتا ہے کہ تیرے آنے کے سارے امکانات ختم ہو چکے ہیں لیکن کیوں ختم ہو چکے ہیں اس کا وہ جواب نہیں دیتا ہے اور یہی خاموشیاں پھر متنوع تلازمات کو ابھارتی ہیں اصل میں یہ شعر کا داخلی تجربہ ہے جو نو بہ نو جلوں کو خلق کرتا ہے اور معنی سے ماورا ہو کر اپنے آزادانہ وجود کا اثبات کرتا ہے۔ اس لیے نارنگ صاحب کا خیال میرے تصورِ تجربہ سے متعلق قطعی طور غلط ہے۔

سوال : آپ نے اپنی کتاب ''اکتشافی تنقید کی شعریات'' کے صفحہ ۸۱ پر لکھا ہے کہ ''شاعری کو اس کے وسیع تر کائناتی تناظر میں دیکھنے سے اس کی آفاقیت کے تصور کو پرکھنے کا تصور لاحق ہوجاتا ہے ظاہر ہے شاعری میں ان اصولوں کی نشاندہی کرنا لازمی ہوجاتا ہے جو عالمگیریت رکھتے ہیں''۔ آپ کا مفروضہ یہ ہے کہ شاعری میں پیش کیا جانے والا تجربہ universal ہوتا ہے لیکن مابعد جدید مکتبہ ہائے فکر سے تعلق رکھنے والے دانشور تجربے/آئیڈیالوجی کی عالمگیر معنویت کے منکر ہیں۔ ان کے، مطابق ہر تجربہ مقامی ہوتا ہے اور ایک مخصوص ثقافتی ولسانی مزاج کا حامل ہوتا ہے مشل فوکو کہتا ہے کہ ہر ثقافت انسانی وجود human existence اور کائناتی مظاہر کی تفہیم کے تعلق سے جن تدابیر کو بروئے کار لاتی ہے وہ طاقت کی زائیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے دائرہ کار میں محدود ہوتی ہیں۔ علمیہ episteme ہمیشہ مقامی ہوتا ہے اور کسی عالمگیر انسانی صورتحال کو نہیں درشاتا ہے اس کا اطلاق اگر شعر وادب پر کیا جائے تو اس میں بھی فوکو کی توضیحات کی رو سے علمیہ/آئیڈیالوجی اپنا اثبات کرتی ہے لیکن آپ کا موقف یہ ہے کہ شعر سے ابھرنے والا تجربہ عالمگیر ہوتا ہے آپ کے پاس کیا دلیل ہے کہ تجربہ عالمگیر معنویت کا حامل ہوتا ہے؟

جواب : میری دلیل خود شعری متن ہے۔ دوسری بات یہ کہ میں اس کو مشل فوکو یا کسی دوسرے صاحب کی لاعلمی سے تعبیر کرتا ہوں جو یہ کہتے ہیں کہ شعر میں پیش کیا جانے والا تجربہ universal معنویت سے محروم ہوتا ہے۔ تخلیقی تجربہ آئیڈیولوجی یا کسی

episteme وغیرہ سے ماورا ہوتا ہے۔ تجربہ کے اکتشاف کی ہیئتیں اور لہجے مختلف ہو سکتے ہیں لیکن گہری سطح پر تجربہ کلہم انسانی برادری کی داخلی واردات کو سمیٹتا ہے تجربہ ماورائے سیاست اور ماورائے آئیڈیالوجی ہوتا ہے، میرا ایک شعر ہے :

جاگ کر بھی خواب کا عالم رہا
وادیِ خوں ناب کا عالم رہا

مذکورہ شعر کو اگر ایک عام قاری پڑھے گا تو وہ بادی النظر میں یہی کہے گا کہ شاعر کشمیر کی معاصر صورتحال کو بیان کر رہا ہے لیکن گہری سطح پر یہ شعر جس تجربے کا اکتشاف کرتا ہے۔ وہ اپنی ماہیت کے اعتبار سے عالمگیر ہے اگر ہم اس سے ابھرنے والے تجربے کو episteme یا آئیڈیالوجی کا ماحصل قرار دیں تو اس کا تخلیقی وجود محدود ہو کے رہ جائے گا۔ تجربہ ہمیشہ عالمگیر معنویت کا حامل ہوتا ہے لیکن شرط ہے کہ شعر تخلیقی تقاضوں کو پورا کرتا ہو۔

سوال : تخلیقیت کے کیا معنی ہیں اور زبان کے تخلیقی برتاؤ سے آپ کی کیا مراد ہے؟

جواب : تخلیقی برتاؤ سے میری مراد یہ ہے کہ شاعر/قلم کار اپنے تجربے کو گرفتار کرنے کے لیے جن الفاظ کا انتخاب کرتا ہے وہ متن میں جہت در جہت صورتحال کو انگیز کرنے کے متحمل ہوں۔ اگر الفاظ مذکورہ کارگزاری کو سرانجام دینے کے تعلق سے ناکام ہو جاتے ہیں تو شعر کا تخلیقی معیار پست ہو جاتا ہے۔

سوال : اب ہم نقاد اور قاری کی بحث پر آتے ہیں رولاں بارتھ نے اپنے مضمون death of author میں لکھا ہے کہ متن پر مصنف کے تسلط کے خاتمے کے ساتھ ہی اس تفہیم کے حوالے سے نقاد کی اجارہ داری بھی ختم ہو گئی ہے مصنف محرر ہو کے رہ گیا اور نقاد قاری۔ آپ اپنی کتاب ''اکتشافی تنقید کی شعریات'' کے صفحہ ۸۳ پہ لکھتے ہیں کہ ''قاری خواہ کتنا ہی باصلاحیت ہو بہر حال قاری ہے نقاد نہیں ناچار اس کے لیے ابہام کی ریشہ دوانیوں سے نمٹنے کے لیے ایک باریک بیں اور نکتہ سنج نقاد کی ضرورت پڑتی ہے ایسا نقاد لسانی شعور کی آگہی کے ساتھ ساتھ تخلیقیت کے رموز سے بہرہ ور ہوتا ہے''۔ لیکن قاری اساس مکتبۂ تنقید سے تعلق رکھنے والے مفکرین، رولاں بارتھ، وولف گانگ آیزر، ڈیوڈ بلیک، سٹینلے فش، نارمن ہالینڈ تفہیم متن کے حوالے سے نقاد کی مستبدانہ حیثیت کو مشتبہ قرار دیتے ہیں؟

جواب : قاری جب تک لسانی آگہی سے بہرہ ور نہ ہو جس متن کا وہ مطالعہ کرتا ہے اس کی زبان کی باریکیوں کا علم نہ رکھتا ہو متن کی پشت پر کھڑی روایت سے شناسا نہ ہو تب تک وہ اس سے معاملہ کرنے کی اہلیت سے محروم ہوتا ہے مذکورہ اہلیت سے بہرہ ور قاری ہی میرے خیال میں نقاد ہوتا ہے کچھ لوگ عام قاری کو بھی متن سے معاملہ کرنے کا اہل قرار دیتے ہیں لیکن میرے خیال میں متن میں مستور تجربہ کبھی بھی عام قاری پر اپنا اکتشاف نہیں کرتا ہے۔ شاعری پردوں میں ہوتی ہے اور ان پردوں کو اٹھانے والا نقاد ہوتا ہے۔

سوال : آپ کے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ صرف نقاد متن کی اصل تک رسائی حاصل کر سکتا ہے

جواب : جی بالکل

سوال : پھر تو آپ متن میں مرکز کی موجودگی اور اس پر نقاد کے تسلط کو justify کرتے ہیں؟

جواب : آپ لفظوں میں گرفتار ہو گئے میں تجربے کو امکان در امکان صورتحال سے تعبیر کرتا ہوں جو اپنا اکتشاف صرف نقاد پر کرتا ہے۔

سوال: آپ نے اپنی کتاب ''اکتشافی تنقید کی شعریات'' کے صفحہ ۱۰۱ پر لکھا ہے کہ ''شاعر اپنے وجود کو باطن سے امنڈ نے والے تجربے کے حوالے نہیں کرتا ہے بلکہ وہ اس پر اثر و اقتدار قائم کرتا ہے یعنی وہ اپنے تجربے کی ہیجانی کیفیت کو تعقلی قوت سے قابو میں کرتا ہے۔'' آپ کے مطابق تجربہ الہامی ہوتا ہے وہبی ہوتا ہے کشفی الاصل ہوتا ہے۔ کیا آپ کو نہیں لگتا ہے کہ یہ ایک غیر سائنسی تصورِ تخلیق ہے الہامی اور کشفی کے بجائے آپ ''لاشعوری الاصل'' کی اصطلاح بھی استعمال کر سکتے تھے جیسا کہ فرائیڈ نے ثابت کیا کہ تخلیق کے سوتے لاشعور سے پھوٹتے ہیں؟

جواب : آپ لاشعور کہیں یا الہام دونوں ایک ہی چیز ہے جس کے سوتے ہمارے ذہن کے نہاں خانوں سے پھوٹتے ہیں الہام ایک جامع اصطلاح ہے میں نے اسے مروجہ مفہوم کے برعکس اپنی کتاب میں برتا ہے اس سے مراد ادراک کی وہ قوت ہے جو حواسِ خمسہ کو transcend کر کے مظاہر کائنات کے مخفی گوشوں تک شاعر کو رسائی دلاتی ہے۔ الہام کبھی آسمان سے نہیں اترتا ہے۔

سوال : قمر رئیس نے آپ کی کتاب ''معاصر اردو تنقید'' کے بارے میں لکھا ہے کہ ''یہ بیسویں صدی کی گمراہ کن کتاب ہے۔؟''

جواب: (مسکراتے ہوئے) قمر رئیس اور دوسرے ترقی پسند نقاد کہتے ہیں کہ میری تھیوری سماج اور تہذیبی عوامل کو نظر انداز کرتی ہے یہ من مانی باتوں پر مبنی ہے۔ لیکن اس کے برعکس میرا موقف یہ ہے کہ شاعری اگر برہنہ ہو تو وہ تخلیق کے معیار سے گر جاتی ہے ترقی پسند دور میں لکھا گیا ادب بہت کم تخلیقی تقاضوں کو پورا کرتا ہے میرا یہ ابتدا سے ہی موقف رہا ہے کہ شاعری میں پیش کیا جانے والا تجربہ ماورائے سیاست ہوتا ہے باقی قمر رئیس صاحب، اللہ مغفرت کرے، ان کی ساری تنقید اشترا کی منشور کا حاشیہ دکھائی دیتی ہے۔

سوال : آپ کے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ترقی پسند ادب اس لیے تخلیقی تقاضوں کو پورا نہیں کرتا ہے کہ اس میں نری حقیقت نگاری ہے اور ترقی پسند تنقید محض اشترا کی منشور کا حاشیہ ہے۔ لیکن پچھلی کئی دہائیوں سے مارکسی فکر کئی ساری تبدیلیوں سے گزری۔ اب نو مارکسیت یا revisionist marxism کے نام سے ایک نیا ڈسکورس سامنے آیا ہے جس کو فرینکفرٹ اسکول آف تھیوری کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ نو مارکسی مکتبۂ تنقید سے تعلق رکھنے والے مفکرین کا کہنا ہے کہ جہاں متن کی تشکیل میں زبان کا رول کلیدی ہوتا ہے وہیں آئیڈیالوجی زبان کے جینیاتی نظام میں ایک جامع رمز code کے بطور رقم ہوتی ہے۔ آئیڈیالوجی کبھی بھی معصوم اور غیر جانبدارانہ نہیں ہوتی ہے بلکہ طاقت اور ادارہ جاتی نظام کی پروردہ ہوتی ہے اور یہی آئیڈیالوجی تخلیقی اور غیر تخلیقی متون میں اپنا اثبات کرتی ہے اس لیے متن کبھی بھی غیر سیاسی اور الہامی نہیں ہوتا ہے آپ کی کیا رائے ہے؟

جواب : روایتی مارکسیت اور نو مارکسی مکتبۂ تنقید سے تعلق رکھنے والے نقاد متن کو ایک مخصوص نظریاتی عینک سے دیکھنے کے عادی ہیں وہ متن کی ساخت میں پنپنے والے تخلیقی تجربے کو سیاست کی بھینٹ چڑھاتے ہیں اور اس کی جگہ آئیڈیالوجی وغیرہ کا

راگ الاپتے ہیں میں نے آپ سے پہلے بھی کہا کہ تجربہ وہی ہوتا ہے اور آیڈیالوجی/ سیاست وغیرہ سے ماورا ہوتا ہے شاعری چیزے دیگراست، اس کو کسی سیاسی پیمانے سے ناپنے کو میں اس کی روح کو پامال کرنے کے مترادف قرار دیتا ہوں۔

سوال: شمس الرحمان فاروقی نے آپ کی تھیوری کے بارے میں لکھا ہے کہ ''حامدی کاشمیری اکتشافی تنقید کا خون لگا کر تھیوری کے شہیدوں میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔؟''

جواب: (قہقہہ) شمس الرحمان فاروقی جیسے پڑھے لکھے نقاد کے قلم سے جب اس طرح کے غیر ذمہ دارانہ الفاظ نکلیں تو صرف افسوس کیا جاسکتا ہے۔ یہ ان کی ذاتی رائے ہے جس کا میری تھیوری کے بنیادی مقدمات سے کوئی تعلق نہیں، میری تھیوری پر کوئی بامعنی بحث قائم کرنے کے بجائے انھوں نے فتوی دے دیا۔ فاروقی صاحب کی ہر تنقیدی کتاب کا میں نے بغور جائزہ لیا ہے ان کی تحریروں کو پڑھنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ مضمون لکھتے وقت بہت زیادہ عجلت سے کام لیتے ہیں وہ کہتے تو بہت کچھ ہیں لیکن ثابت شاید کچھ بھی نہیں کر پاتے۔ مضمون کے پہلے ہی جملے سے بحث چھیڑتے ہیں جو بالآخر تشنۂ تکمیل ہی رہتی ہے۔ ان کی کتاب ''شعر شور انگیز'' کی بات کی جائے تو اس میں انھوں نے فقط میرؔ کے شعروں کے دو دو چار چار معنی بیان کئے ہیں۔ اس طرح کا تشریحی اپروچ اختیار کر کے فاروقی صاحب، میرؔ کے شعروں سے ابھرنے والے جہت در جہت تجربے کو معنی کی صلیب پر لٹکاتے ہیں میں یہ کہنے کی آزادی لوں گا کہ فاروقی صاحب میرؔ کے شعروں کے تجربے تک رسائی حاصل کرنے میں بری طرح ناکام ہوئے ہیں۔

سوال: تھیوری کی جامع اصطلاح کے تحت کئی سارے مباحث سامنے آئے جیسے ساختیات، پسِ ساختیات اور اس قبیل کے دوسرے کلامیے، آپ ان سے کس حد تک متاثر ہوئے؟

جواب: میں نے ان نظریات کو پڑھا ضرور ہے لیکن میری تھیوری کے حوالے سے ان مباحث کی تشکیلی حیثیت صفر کے برابر ہے

سوال: آپ کی تھیوری کے حوالے سے آخری سوال، کیا آپ کے مکتبۂ تنقید کو آگے بڑھانے والا خود بھی تخلیق کار ہو؟ کیونکہ آپ کے مطابق تخلیق پر اسرار ہوتی ہے؟

جواب: ضروری نہیں ہے لیکن نقاد کا باشعور ہونا لازمی ہے تاکہ تجربہ اس پر اپنا اکتشاف کر سکے۔

سوال: حامدی صاحب میرے خیال بنیادی موضوع کے حوالے سے مجھے جو پوچھنا تھا وہ میں پوچھ چکا ہوں۔ اب میں موضوع سے ہٹ کے آپ سے چند سوالات کرنے کی اجازت چاہوں گا:؟

جواب: (مسکراتے ہوئے) شوق سے۔

سوال: جس وقت آپ شعر لکھتے ہیں تو اس وقت آپ کا تنقیدی شعور آپ کی رہنمائی کرتا ہے؟

جواب: جی بالکل، وہ تخلیق کے پروسیس کے دوران میرے ساتھ ہی رہتا ہے۔

سوال: اردو تنقید کی موجودہ صورتحال کے بارے میں آپ کیا کہنا چاہیں گے؟

جواب : جس زمانے میں، میں تنقید لکھتا تھا (اب تو صرف شعر لکھتا ہوں) اس وقت اردو کے تنقیدی افق پر تین نام چھائے ہوئے تھے پاکستان کے وزیر آغا، دلی کے گوپی چند نارنگ اور الہ آباد کے شمس الرحمان فاروقی۔ ان کے علاوہ جتنے بھی لوگ تنقید لکھتے تھے ان کی حیثیت حاشیائی تھی لیکن ان تین نقادوں کے سمیت کوئی بھی شعر سے ابھرنے والے تجربے کی بات نہیں کرتا تھا اور نہ ہی کسی نے کی ہے۔ ساری تنقید مکتبی مزاج کی حامل تھی اور نقاد تشریحی رویوں سے کام لے رہے تھے موجودہ تنقید بھی شعر کی باطنی تجربے کو ٹٹولنے کے حوالے سے بری طرح ناکام نظر آتی ہے۔

سوال : جموں و کشمیر میں لکھے جانے والے ادب (چاہے وہ شاعری ہو یا پھر افسانہ) سے آپ کس حد تک مطمئن ہیں؟

جواب : جموں و کشمیر میں لکھا جانے والا بیشتر ادب ٹھوس تخلیقی قوتوں سے محروم نظر آتا ہے۔ شاعری کے حوالے سے تو صورتحال اتنی مایوس کن نہیں ہے تاہم فکشن کے حوالے سے ابھی تک ایک بھی genuine قلم کار سامنے نہیں آیا ہے اور شاعری بھی تناسب کے لحاظ سے پانچ دس فی صد ہی معیاری ہے ادب خواہ وہ شاعری ہو یا پھر افسانہ جب تک تخلیقی تقاضوں کو پورا نہیں کرتا ہے اسے genuine قرار نہیں دیا جا سکتا ہے۔

سوال : آپ کا مضمون بہت پہلے رسالہ بازیافت میں شائع ہوا ہے اس میں آپ نے اس وقت کے نوجوان شعرا میں سے شفق سوپوری اور اقبال فہیم کو معیاری شاعر قرار دیا ہے کیا آپ آج بھی اپنی رائے پر قائم ہیں؟

جواب : اُس وقت تو اچھا لکھتے تھے اِس وقت کا مجھے پتہ نہیں ہے لیکن اس وقت رفیق راز قدرے بہتر لکھتے ہیں۔

سوال : حامدی صاحب آپ کی شخصیت کثیر الجہت ہے۔ آپ نے تنقید لکھی، شاعری کی اور فکشن بھی لکھا، ذاتی طور پر آپ خود کو کس میدان میں مطمئن پاتے ہیں؟

جواب : شاعری میں، اس لیے عمر کے اس مقام پر پہنچ کر بھی مجھ سے شوقِ سخن نہیں چھوٹا۔

سوال : ملکی اور ریاستی سطح پر آپ کے خیال میں اردو کا مستقبل کیا ہے؟

جواب : کوئی بھی زبان تب تک فروغ نہیں پاتی ہے جب تک کہ اس کو سرکاری پشت پناہی حاصل نہ ہو اارد و کا دائرہ کار ایک بولی کی صورت میں وسعت پا رہا ہے اور بحیثیت زبان یہ شدید قسم کے خطرات سے دوچار ہے۔ سرکار اگر ٹھوس اقدام اٹھاتی ہے تو مایوس ہونے کی ضرورت نہیں ہے ورنہ زیادہ دیر تک خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہا جا سکتا ہے۔

سوال : آجکل ریاست کے اردو حلقوں میں ایک تاثر بہت عام ہو چکا ہے اور وہ یہ کہ ''کشمیر اردو کی آخری پناہ گاہ ہے ''۔ کیا اتفاق کرتے ہیں؟

جواب : کسی حد تک۔ کیونکہ باقی ریاستوں میں اردو کی صورتحال ناگفتہ بہ ہے۔ سچ پوچھئے تو اردو کو مذہب کے ساتھ جوڑ کر اسے پیچھے کی اور دھکیلا جا رہا ہے۔ بہار اور اتر پردیش کی سرکاروں نے اردو کی ترویج کے حوالے سے کچھ منصوبہ جات تشکیل دیے

تھے تاہم ان کی زمینی ترمیم کے حوالے سے کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا گیا۔کشمیر میں اردو، کالج اور ہائرسکینڈری سطح پر ایک اختیاری مضمون کے طور پڑھائی جارہی ہے لیکن سرکاری زبان ہونے کی حیثیت سے اسے ایک لازمی مضمون کے بطور پڑھایا جانا چاہیے تب ہی ہمارا یہ دعویٰ صحیح ثابت ہوسکتا ہے کہ کشمیر اردو کی آخری پناہ گاہ ہے۔

سوال : حامدی صاحب یہ مکالمہ محکمہء اعلیٰ تعلیم کی جانب سے شائع ہونے والے رسالے کی زینت بننے جارہا ہے۔ظاہر سی بات ہے کہ اس کے اولین قاری کالج کے اساتذہ ہوں گے۔آپ بھی لمبے عرصے تک کالج اور یونیورسٹی سطح پر درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ رہے ہیں۔آپ کے مطابق اردو کی تدریس سے وابستہ اساتذہ اپنی صلاحیتوں میں کیسے نکھار لاسکتے ہیں یا وہ کس طرح اپنی منصبی ذمہ داریوں کو بہتر طور پر سرانجام دے سکتے ہیں؟

جواب : مطالعے میں زیادہ سے زیادہ وقت صرف کریں، تنقید اور تحقیق کی سطح پر جو نئی چیزیں سامنے آرہی ہیں ان کو سمجھنے کی کوشش کریں اور معاصر تنقیدی تناظرات کی رو سے بچوں کو ادب پڑھائیں۔اساتذہ کو یہ بات ذہن میں رکھنی ہوگی کہ انھیں شاعری/ افسانہ کی صورت میں جس چیز کا سامنا ہے وہ تہہ در تہہ ہے اس کی تفہیم اور تدریس کا کام وہ تب تک سرانجام نہیں دے سکتے ہیں جب تک کہ ان کے علم کا افق وسیع تر اور مشاہدہ ٹھوس نہ ہو۔جس کا حصول مطالعے کے بغیر ناممکن ہے۔

سوال :ایک آخری سوال، آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ موجودہ مکالمے کے پسِ پشت محکمہء اعلیٰ تعلیم ریاست جموں کشمیر کے پرنسپل سکریٹری ڈاکٹر اصغر حسن ساموں صاحب بنیادی محرک کی حیثیت سے کارفرما ہیں اور ان کے ایما پر اردو زبان میں ایک ادبی جرنل شائع ہونے جارہا ہے ان کی اس کاوش کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

جواب : ڈاکٹر اصغر حسن ساموں صاحب جس خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں وہ ابتدا سے ہی علم وادب کا دلدادہ رہا ہے۔ ان کے برادرِ اکبر جناب مسعود ساموں صاحب ایک وسیع النظر عالم اور صاحبِ فکر ادیب ہیں۔خود ڈاکٹر اصغر ساموں کو میں نے ادبی سیمیناروں میں سنا ہے اور مجھے یہ اندازہ ہوا کہ وہ خود بھی ادب کے ایک باذوق قاری ہیں۔میں یہی کہوں گا کہ ان کی یہ کاوش لائقِ تحسین اور قابلِ ستائش ہے۔

سوال : حامدی صاحب اپنا قیمتی وقت دینے کے لیے آپ کا بہت بہت شکریہ۔

جواب : آپ کا بھی شکریہ۔